۱ آخری خواہش

انور قمر

جان پہچان : انور قمر ۵؍فروری ۱۹۴۱ء کو ناشک میں پیدا ہوئے۔ ممبئی میں تعلیم حاصل کی۔ تیس برس تک کیٹرنگ کے پیشے سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں اُن کا ایک منفرد اور نمایاں مقام ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماج کے متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے نادار، مظلوم اور مجبور افراد کے مسائل کو نہایت چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ انسانی نفسیات کی گرہ کشائی میں انھیں خاصی دسترس حاصل ہے۔ زندگی اور سماجی مسائل سے جڑے ان کے افسانوں میں سیاسی اور معاشرتی بصیرت کے ساتھ رمزیت اور اشاریت کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ ’چاندنی کے سپرد، چوپال میں سنا ہوا قصہ، کلر بلائنڈ‘ اور ’جہاز پر کیا ہوا؟‘ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ مہاراشٹر اُردو ساہتیہ اکیڈمی نے انھیں انعام سے نوازا ہے۔ ’آخری خواہش‘ انور قمر کے چوتھے مجموعے ’جہاز پر کیا ہوا؟‘ میں شامل ہے۔ افسانہ بظاہر سادہ اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ سزائے موت پانے والے کردار کی آخری خواہش بھی بہت معمولی ہے مگر اس معمولی خواہش کے پس پردہ انسانی زندگی کی المناکی، بے وقعتی اور محرومی کو اس فنکارانہ خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ افسانے کے اختتام پر قاری تڑپ اُٹھتا ہے۔ اپنی سادگی اور پُرکاری کے سبب یہ افسانہ قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے اور یہی اس افسانے کی خوبی ہے۔

”ہجور! آخری خواہش تو یہ ہے کہ مجھے آپ پھانسی پر لٹکانے سے پہلے بہت سا دال بھات کھانے کو دے دیں۔“

انگریز مجسٹریٹ نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو مجرم کی آخری خواہش پوری کرنے کا حکم صادر فرمایا اور ’کورٹ اِز اڈ جرنڈ‘ کہہ کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

’پرما‘ جو اڑیسہ کے جنگلوں میں بسے ادی باسیوں کے قبیلوں میں سے کسی ایک کا فرد تھا، اپنے جھونپڑے کے باہر بیٹھا ناریل کے پتوں اور بانس کی پھچیوں سے ٹوکریاں بناتا تھا۔ وہ تمام ادی باسیوں کی طرح صرف ایک بالشت کپڑے سے اپنے نچلے بدن کو ڈھانکے رہتا۔ اس کے گلے میں رنگ برنگ پتھروں کی مالائیں پڑی رہتیں۔ چہرے کو وہ سرخ، سبز اور سفید رنگ سے یوں پینٹ کیا کرتا تھا کہ وہ رنگ گویا اُس کی آبائی شناخت کے مظاہر ہوں۔ وہ دبلا پتلا اور لمبا شخص تھا۔ عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ جب شکار کے پیچھے دوڑتا تو نشیب و فراز کا فرق مٹ جاتا۔ اُس کی رفتار میں کمی نہ آتی۔ راہ میں آنے والے پودوں پر سے وہ قلانچ مار کر گزر جاتا۔ پیڑ کی جھکی ہوئی ٹہنیوں کو دور ہی سے دیکھ کر، جھک کر، ہاتھوں کو ٹیک کر، چوپایوں کا سا پوز اختیار کر لیتا اور اس کے نیچے سے نکل جاتا۔ سبزیاں، پرندوں کا گوشت اور چاول اس کی غذا تھی لیکن فاقے بھی کرنا پڑتے تھے۔ چاول ہوتے تو سبزیاں نہیں پکتیں، پرندہ ہوتا تو چاولوں سے محروم رہتا۔ کبھی کبھار ہی اُسے پیٹ بھر کھانا نصیب ہوتا۔ جنگلوں میں جڑی بوٹیاں کثرت سے ہوا کرتی ہیں۔ یہ ان کو بھوُن بھان کر کھا لیا کرتا تھا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے اگلے دن تڑکے ہی پھانسی دینے سے پرما کو واقف کر دیا۔ پرما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سپرنٹنڈنٹ عبدالرزّاق خان دراز قد چوڑا چکلا شخص تھا جس کی گھنی اور پیچ دار مونچھیں اور گول بادامی رنگ کے شیشوں کی عینک اُسے خطرناک حد تک بارعب بنائے ہوئے تھی۔ اُس کے آفس میں سیلن، پرانے کاغذوں اور فائلوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے شیشم کا سیاہ گول ڈنڈا ہاتھوں میں مانجھے کی پھرکی کی طرح گھماتے ہوئے پوچھا، ”تجھے کھانا کب دیا جائے؟“

”پھانسی سے پہلے۔“

”رات کو باورچی خانہ بند ہوتا ہے۔ شام کو پکا کر رکھا ہوا کھا لے گا؟“
”کھانے کو تو میں کئی دن کا باسی کھا لوں گا۔ مگر چونکہ یہ آخری بھوجن ہوگا اس لیے گرما گرم کھانے کو جی چاہتا ہے ورنہ کوئی بات نہیں۔“
”ٹھیک ہے! کتنا کھائے گا؟“
یہ کہہ کر عبدالرزّاق خان نے اپنے چمڑے کے جوتوں سمیت پیر اونچے ٹیبل پر رکھ دیے۔ پرما کرسی پر ٹیبل کی دوسری جانب اُکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ پرما نے دونوں ہاتھ پھیلا کر چاول کی مقدار بتائی، ”اِتنا...“
”اور دال؟“
پرما نے بالٹی کا بطور ظرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پھر اُس کے تلے سے اوپر تک بھرے رہنے کا اشارہ کیا۔ عبدالرزّاق خان نے چشمے کی بادامی کانچ کے اوپر سے اُسے گہری نظر سے دیکھا۔ گویا وہ اتنی بڑی مقدار میں دال بھات طلب کرنے کا اصل سبب جاننا چاہتا ہو۔ ”اتنا کھا لے گا تو؟“
پرما نے دوبارہ اثبات میں گردن ہلا دی۔
اگلے دن پھانسی تھی۔ پرما کے سر کے بال اُسترے سے اُتارے گئے۔ داڑھی بنائی گئی، قیدیوں کی نئی وردی پہننے کو دی گئی۔ کوئی اس کے مذہب سے واقف نہ تھا۔ پرما خود واقف نہ تھا۔ چنانچہ پادری، مولوی، پنڈت اور بودھ بھکشو کو بلایا گیا۔ چاروں نے اپنے اپنے طرز پر اُس کی نجات کی دعا کی۔ اسے اپنی اپنی مذہبی زبان میں آخرت پر بھروسا اور گناہ کی بخشش کے لیے دعا مانگنے کی صلاح دی اور چلے گئے۔
مگر جانے سے پہلے بودھ بھکشو نے عبدالرزّاق خان سے پوچھا، ”کیا آپ ہمیں بتانا گوارا فرمائیں گے کہ اسے کس گناہ کی پاداش میں سزائے موت دی جا رہی ہے؟“
”اُس نے ایک انگریز کا قتل کیا تھا۔“
”انگریز کا قتل! مگر کیوں؟“
عبدالرزّاق خان نے اُس کے ساتھ جیل کو محیط اونچی مضبوط اور طویل دیوار کے پھاٹک پر رُکتے ہوئے کہا، ”ایک روز یہ بیٹھا ٹوکری بنا رہا تھا کہ اس کی بیٹی نے گھنے پودوں کے پیچھے چمکتی ہوئی آنکھوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بابا وہ ہرن مجھے لا دے۔ پرما بیٹی پر جان نثار کرتا تھا۔ مسکراتا ہوا اُٹھا اور دوڑ پڑا ہرن پکڑنے کو۔ کافی دور تک اُس نے ہرن کا پیچھا کیا۔ قریب تھا کہ یہ اُسے پکڑ لیتا کہ ٹھائیں کی آواز ہوئی اور ہرن گر کر تڑپنے لگا۔
پرما نے دیکھا کہ ایک انگریز بندوق اُٹھائے دو مقامی لوگوں کے ساتھ ہرن کی طرف چلا آ رہا ہے۔ پرما نے ہرن کی تڑپ اور آنکھوں سے غم و حسرت کا دھواں اُٹھتا دیکھا تو اُسے غصہ نہیں آیا بلکہ بس ایک خیال آیا۔ اُس نے وہاں پڑا ہوا پانچ سیر کا پتھر اُٹھا کر انگریز شکاری کے مستک پر دے مارا۔ چوٹ ایسی شدید تھی کہ موقعِ واردات پر ہی اس کی موت ہو گئی۔“
جیل کے پھاٹک کے پیٹ میں بنا چھوٹا دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ چاروں جیل سپرنٹنڈنٹ سے ہاتھ ملا کر یکے بعد دیگرے باہر چلے گئے۔ ان چاروں کے دلوں کو یہ خیال صدمہ پہنچا رہا تھا کہ انھوں نے جس کی نجات اور بخشش کے لیے دعا کی تھی کیا وہ واقعی میں قصوروار اور سزائے موت کا مستحق تھا؟
کوّے تو پتا نہیں کیا دیکھ کر کائیں کائیں کرنے لگتے ہیں مگر مرغ ایسی غلطی نہیں کرتے۔ جب تک تڑکا نہ ہو، بانگ نہیں دیتے۔ پرما سویا کہاں تھا؟ رات بھر جاگتا رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی کے سخت اور کٹھور، شادمانی اور آنند کے دن یاد آئے۔ ماں کے دیہانت کا دن،

باپ کو سانپ کے کاٹنے اور اُس کے تڑپ کر مر جانے کا دن، بیوی سے بیاہ کا دن، بچی کی پیدائش کا دن، پھر اُسے یاد آیا کہ اُس کے جسم کے تمام اعضا جیل کی مہینے بھر کی قید کے ماحول میں سکڑ سمٹ کر رہ گئے ہیں۔

راہ داری میں سپاہیوں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تین تھے۔ ایک نے بڑا پتیلا کپڑے کی مدد سے پکڑ رکھا تھا، دوسرا بالٹی اُٹھائے ہوئے تھا۔ دونوں ظروف ڈھکے ہوئے تھے۔ جب اُن پر سے ڈھکن ہٹائے گئے تو تازہ پکے ہوئے دال چاول کی بھاپ کے ساتھ ان میں بسی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ اُنھوں نے ایک ٹاٹ بچھا کر ایک ایلومینیم کی بڑی سی رکابی رکھ دی۔ پانی کی صراحی اور گلاس بھی پاس ہی رکھ دیا۔

پرما نے اُن کے رویے میں تبدیلی دیکھی۔ آج اُن کے کھانا پروسنے کا انداز خاصا مہذبانہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ یوں دیتے تھے جیسے کتوں کو راتب دے رہے ہوں۔

اُس نے تھوڑے سے دال چاول رکابی میں ڈال کر کھا لیے۔ جی نہ بھرا تو اور کھائے پھر اور... گویا آج ہی اُسے پیٹ بھر کھانا نصیب ہوا ہو! اُس کے باوجود بہت سا دال بھات بچ گیا۔ اُس نے اسے احتیاط سے ڈھک دیا۔ گلے میں سے رنگ برنگی پتھروں کی مالائیں نکالیں، کلائی پر سے لوہے کا کنگن اُتارا، کان میں پڑے ہوئے سوراخوں میں سے کوڑیوں اور ہاتھی دانت کے حلقے نکالے۔ وہ کپڑا بھی اُس نے دھو کر خشک کر کے احتیاط سے رکھا تھا جسے وہ اپنا ستر چھپانے کے لیے باندھا کرتا تھا۔ اُس نے کل شام ہی کو یہ تمام چیزیں سپرنٹنڈنٹ کی کسٹڈی سے التجا کر کے منگوالی تھیں۔ اس نے ان کو کھانے کے برتنوں کے اطراف یوں سجا کر رکھ دیا تھا گویا ہر چیز اس کے قبضے اور تصرّف میں ہو۔

پھانسی کھڑی ہو چکی تھی۔ جلّاد پھانسی کی ٹکٹکی سے بندھی رسّی کو بار بار کھینچ کر اُس کی مضبوطی کو جانچ رہا تھا۔

عبدالرزّاق خان کے نعل لگے ہوئے جوتوں کی آواز راہ داری میں گونجی۔ تالا کھولا گیا۔ لوہے کا دروازہ کُھلا۔

''پرما چلیں۔ پھانسی کھڑی ہو چکی ہے۔ تڑکا ہونے والا ہے۔''

پرما نے حسبِ معمول اثبات میں گردن ہلا دی۔ پھر فرش پر رکھی ہوئی تمام اشیا کی جانب اُنگلی سے اشارہ کرتا ہوا بولا، ''سرکار! یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں میری ہیں، ہیں نا؟''

خان نے اثبات میں گردن ہلا کر ''ہوں'' کہا۔

پھر اُس نے دونوں برتنوں پر سے ڈھکن ہٹایا۔ اُن میں دال چاول رکھے ہوئے تھے۔

''اور ساب! یہ کھانا؟''

''یہ بھی تمھارے لیے ہی پکایا گیا تھا۔''

''تو پھر میرا ہوا نا؟''

''ٹھیک ہے تمھارا سہی۔''

''تو سرکار! ایک کرم کیجیے گا۔ میری لاش کو لینے کے لیے میری بیوی، میری بیٹی، میرا بھائی وغیرہ آنے والے ہیں۔ یہ بات انھوں نے مجھے پھانسی کی سزا دیے جانے کے دن عدالت میں بتائی تھی۔''

''ہوں'' سپرنٹنڈنٹ خان کے منہ سے پھر نکلا۔

''تو صاحب! ان چیزوں کے ساتھ یہ کھانا بھی اُن کو دے دیجیے گا۔''